اقبال کا تصورِ اجتہاد- اثرات وتسلسل

ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی

علامہ اقبال بیسویں صدی کے عظیم المرتبت اسلامی مفکر ہیں۔ آپ ملت مسلمہ کی زبوں حالی اور اضمحلال کے خاتمے کے لیے نئے طرزِ فکر وعمل کے زبردست خواہاں تھے جو قرآن وسنت کی روح کے مطابق ہو۔ قرآن حکیم کو شاہِ کلید قرار دیتے ہوئے آپ اسے ایک زندہ و پائندہ حقیقت جان کر اس کی تعلیمات کو لازوال قرار دیتے ہیں۔ انھی عوامل کی بنا پر آپ اجتہاد پر کافی زور دیتے رہے تاکہ قرآن وسنت کی حرکی اور زندہ تشریح وتوضیح کر کے زمانۂ جدید کے سیاسی، ثقافتی، عمرانی، تعلیمی اور معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا جائے۔ انھی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اقبالؒ نے خطبات پیش کیے جو تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ کے نام سے ترجمہ ہوکر سامنے آئے۔

عصر جدید میں اجتہاد کے حوالے سے اُن کی مربوط و مدلل فکر اسلامی انھی خطبات میں نمایاں نظر آتی ہے۔ انھی وجوہات کی بنا پر سید ظفر الحسن اقبالؒ کے ان خطبات کو نہ صرف عظیم اصولوں کی شان دار تشریح قرار دیتے ہیں بلکہ علمائے وقت کے لیے ان لیکچرز کو 'معنی خیز ذہنی تحریک'' (Pregnant Suggestions) کا نام دیتے ہیں۔[۱]

اسلام کے وسیع وعمیق مطالعے سے اقبالؒ کو ایسی وسعتِ قلبی نصیب ہوئی تھی کہ انھیں جہاں اور جس فلسفے میں بھی کوئی خوبی نظر آتی تھی وہ اسے نوعِ انسانیت کا مشترکہ ورثہ جان کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنا لیتے تھے۔ فکرِ اقبال کی اسی وسعت کے تناظر میں سید وحید الدین کہتے ہیں:

> اقبال کا مخصوص اندازِ فکر یہ ہے کہ وہ ایک طرف تو مغربی فکر سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مغربی فکر پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھتے بلکہ قرآنی بصیرتوں سے اس کی تصحیح اور تکمیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے عالمِ خلق کو عالمِ امر سے ممتاز کیا ہے۔ وہ فکر کے نئے راستے کھولتا ہے۔[۲]

عبدالمغنی علامہ اقبال کی اجتہادی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اجتہاد واعتماد کے ساتھ حکمائے مشرق اور فلاسفۂ مغرب کے قدیم وجدید نظریاتِ خرد کو قرآن کے اصولِ دانش کی کسوٹی پر پرکھ کر فکر انسانی کے مسلسل ارتقا کا سراغ لگایا ہے اور اس طرح ایک ایسا مربوط نظامِ فکر ترتیب دیا ہے جو جامع، وسیع، عمیق اور نتیجہ خیز ہے۔ یونان اور روم کے خیالات پر عرب وعجم کی تنقیدات سے یورپ اور امریکہ کے انکشافات وایجادات تک کا احاطہ کرکے اقبال نے نہایت اہم موضوعات پر انسانی تصورات کی ایک مستند ومؤثر روداد بہت ہی دلچسپ اور بصیرت افروز انداز سے مرتب کی ہے۔[۳]

اقبال اسلامی تعلیمات کو جدید علوم وفنون کی مدد سے نفسیاتی اور فلسفیانہ طور پر پیش کرنے کی ضرورت پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ خطبات رقم کرنے کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

ان حالات میں (یعنی موجودہ حالات میں) مذہبی حقائق کی سائنٹیفک تعبیر فطری معلوم ہوتی ہے۔ ان خطبات میں مَیں نے اسلام کی فلسفیانہ روایات اور انسانی علم کے مختلف شعبوں میں پیش آنے والی حالیہ ترقیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، مسلمانوں کے مذہبی فلسفے کی تشکیل جدید کی جُزوی طور پر کوشش کی ہے۔ موجودہ دور اس کام کے لیے بالکل سازگار ہے۔[۴]

درحقیقت اقبال مغربی تہذیب وتمدن کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو روکنے کے لیے، جدید ذرائع و وسائل کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس لیے انھیں اس حقیقت کا زبردست احساس رہا ہے کہ اسلام چونکہ ایک انقلابی تحریک ہے، لہٰذا یہ تمام نظامِ حیات پر ہر زمان ومکان کے مطابق قابلِ عمل ہے۔ لیکن برسوں کے جمود وانجماد نے مسلمانوں کے قلوب کو مضمحل کر دیا ہے اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو جدید فکر ونظر میں پیش کیا جائے، تاکہ ایک بار پھر یہ سسکتی ہوئی انسانیت کے دل ودماغ کو اپنی ضیا پاشی سے منور کر دے۔ اسی لیے آپ تقلید وجمود کے بجائے اجتہاد پر زور دیتے رہے۔ تاہم ان کی یہ پیش رفت سست اور دھیمی پڑ گئی تھی۔ اس کا ایک بڑا سبب قدامت پسند طبقے کا خوف اور عدمِ اعتماد ہے جو اجتہاد کے بجائے تقلید کو بہتر سمجھتا ہے۔[۵]

علامہ اقبال اجتہاد کے بارے میں بے حد سنجیدہ، محتاط فکر ونظر اور حزم واحتیاط سے سوچ بچار کرتے رہے۔ بالآخر آپ نے لاہور میں ۱۹۲۴ء میں انتہائی نازک موقعے پر اپنا خطبۂ اجتہاد پیش کیا جب کہ تنسیخِ خلافت کے واقعے کو ابھی صرف چھ ماہ ہوئے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے تنسیخ خلافت کا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ تحریک خلافت بھی ابھی جاری تھی۔ ان حالات میں تنسیخ خلافت کی حمایت اور اسے اجتہادی عمل قرار دینا اقبال کی اولوالعزمی کا اظہار ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ دراصل اُس ساری صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنے کے لیے، اس وقت کے سیاسی اور تاریخی پسِ منظر کو مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

مصطفیٰ کمال اتاترک نے جب ''خلافتِ اسلامیہ'' کا ادارہ جو ''خلافت عثمانیہ'' کے نام سے ملقب تھا، ختم کر دیا تو اقبالؒ نے بھی اولین ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیّاری بھی دیکھ[۶]

علامہ نے تجویز کیا کہ پہلے مسلمان ممالک غلامی سے نجات حاصل کریں اور اپنے اپنے علاقوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی اہلیت پیدا کریں، اس کے بعد اسلامی کامن ویلتھ قسم کی کوئی شے وجود میں آ سکے گی۔ اسی لیے علامہ اقبال نے ترکوں کے ''تجدد'' کو اس وقت نیک فال جانا اور چاہا کہ دیگر مسلم معاشرے بھی اپنے اپنے سرمایۂ فقہ و قانون کو کھنگالیں۔ سعید اکبر آبادی اقبال کے اس رویے کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علامہ صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کا دردوغم اپنے دل میں رکھتے تھے۔ اس بنا پر جب وہ دیکھتے تھے کہ اقوام شرق وغرب سب پر ایک قسم کا سکونِ مرگ طاری ہے تو طبعی طور پر ان کو بڑا صدمہ اور رنج ہوتا تھا۔[۷]

یہی وجہ ہے کہ جب اقبال نے ترکی میں جمود اور سکونِ مرگ کے برخلاف انقلاب اور تبدیلی کے آثار دیکھے تو اس پر خوش ہو گئے کہ چلو حرکت وعمل کا آغاز تو ہو گیا۔ وہ غلط عمل کو بے عملی پر ترجیح دیتے تھے، کیونکہ بے عملی میں موت مضمر ہے۔ پیام مشرق میں آپ کہتے ہیں:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں زیستن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است[۸]

جب یورپ میں فاشزم کی ایک حرکت مسولینی کی شکل میں پیدا ہوئی اور سنٹرل ایشیا میں کمیونزم اور سوشلزم کا دھما کا خیز انقلابِ روس کی صورت میں پیدا ہوا، تو اقبال ادھر بھی متوجہ ہو گئے اور اسے بہ نظر استحسان دیکھنے لگے لیکن اُن کا یہ فوری تاثر ہوتا تھا۔ سعید اکبر آبادی اس بارے میں بھی بحث جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب یہ (انقلابی) تحریکیں اپنے مضمرات اور مقاصد کے ساتھ آگے بڑھتیں اور اپنے اصل رنگ وروپ میں نمایاں ہوتیں تو علامہ تنقید کے نشتر سے ان پر عملِ جرّاحی کرتے اور ان کا کھرا کھوٹا سب دنیا کے سامنے پیش کر دیتے۔ پس یہی معاملہ ترکی میں ضیا کی شاعری اور کمال اتاترک کی

اصلاحات کے ساتھ پیش آیا۔ اس لیے کسی تحریک سے متعلق علامہ اقبال کی اصل رائے وہ ہے جو اس تحریک کے نشیب و فراز کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد بالکل اخیر میں ظاہر کی ہے نہ کہ وہ جس کا اظہار تحریک کے بالکل آغاز میں کیا ہے۔[9]

مصطفیٰ کمال اتاترک سے اقبال نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں کیونکہ اس نے قدم قدم پر مغربی تہذیب و تمدن کی اندھی تقلید جاری رکھی جس سے اسلامی اقدار پر شدید ضربیں پڑنے لگیں۔ اقبال اس وجہ سے کمال اتاترک سے بددل ہو گئے اور انھوں نے جاوید نامہ، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم وغیرہ میں ان کی مذمت کی۔ چنانچہ ضربِ کلیم میں آپ مصطفیٰ کمال کو تجلّیِ افرنگ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تُو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تُو، زرنگار و بے شمشیر[10]

دوسری جگہ اتاترک کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں اُلجھا تُو
دارُو ہے ضعیفوں کا 'لا غالبَ الاّ ھُو'[11]

۱۹۳۱ء میں اقبال جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبانی فرماتے ہیں کہ اگر ترکی کے لات و منات افرنگ سے آئیں تو کعبے کے لیے رختِ حیات نیا نہیں بن جائے گا کیونکہ ترکوں کی تازہ تہذیب کی جدتیں تو افرنگ ہی کی پرانی باتیں ہیں:

مصطفیٰ کو از تجدد می سرود
گفت نقشِ کہنہ را باید ز دود
نو گردد کعبہ را رختِ حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات
ترک را آہنگِ نو در چنگ نیست
تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست[12]

علامہ اقبال نے ترکوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اپنی تہذیب چھوڑ کر مغرب کے فسوں میں غرق نہ ہو جاؤ، اگر مسلمانوں کی طرح جگر رکھتے ہو تو اپنے ضمیر پر نظر ڈالو اور قرآن کریم کی تعلیمات پر نظر رکھو:

چوں مسلماناں اگر داری جگر
در ضمیر خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست
یک جہانش عصر حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست
ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش[۱۳]

دراصل ترکی نے اتحادیوں کے پنجے سے چھوٹ کر مغرب کی کورانہ تقلید کی اور ناعاقبت اندیشانہ اصلاحات کو رواج دیا جس سے پورے عالم اسلامی کو زبردست دھچکا لگا۔ لہٰذا اقبال نے ان اصلاحات سے آخر کار یہی اندازہ کیا کہ روحِ مشرق ابھی بدن کی تلاش میں ہی سرگرداں ہے اس لیے آپ پکار اٹھے:

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی[۱۴]

ترکی میں کمال اتاترک نے تجدید دین کا علم بلند کیا لیکن دینِ اسلام کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر وہ بہک گیا۔ اُس نے ترکوں میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کے بجائے اُلٹا اُن میں مغربی جنون پیدا کر دیا اور تقلید فرنگی میں چُور ہو کر عربی کی جگہ لاطینی رسم الخط کو رائج کر دیا۔ انتہا یہ کی کہ آئین اسلامی کی جگہ ضابطہ سویس (Swiss Code) نافذ کر دیا۔ اسی طرح ایران میں بھی رضا شاہ پہلوی نے یہی تباہی مچادی۔ افغانستان میں بھی امان اللہ خان نے اسی قسم کی ''اصلاحات'' کا فریضہ انجام دیا۔ ادھر برصغیر پاک و ہند میں بھی بدقسمتی سے انگریزوں کی شاطرانہ پالیسیوں کے ذریعے مرزا غلام احمد قادیانی (جھوٹے مدعیِ نبوت) نے اعلانیہ طور پر مسلمانوں کو اپنی تقلید (غلامی) میں مبتلا کرنے کی مذموم کوشش کی۔ مگر مرورِ زمانہ کے ساتھ

ساتھ جب یہ متجدد لوگ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوئے تو علامہ نے ضربِ کلیم میں ہی ان پر کاری ضرب لگاتے ہوئے ملت کو بیدار کیا اور بتایا:

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک!
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ[۱۵]

علامہ اقبال کے مختلف خطبات و تقاریر، مکاتیب اور اشعار میں بعض ایسے افکار نظر آتے ہیں جو ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں اور بعض ایسے نظریات بھی ہیں جن پر مختلف اہلِ علم حضرات نے تبصرے بھی کیے ہیں اور یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ علامہ اقبالؒ کے اخلاص و عمل اور تجدید واحیائے دین کے عملِ صالح کے بارے میں جہاں مکمل اطمینان وایقان حاصل ہوتا ہے، وہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ حیات جس کی بقا کے لیے وہ ساری عمر تڑپتے رہے اور نفاذِ کتاب وسنت جو اُن کی زندگی کا ماحصل تھا۔ علامہ کی یہ تڑپ ان کی نثری تحریروں میں نمایاں ہے۔ قائداعظم کے نام علامہ کے خطوط سے بھی یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔

غرض علامہ اقبالؒ احوالِ زمانہ کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہے، رُکے نہیں، اسی لیے ان کا تصورِ اجتہاد خود اجتہاد ہی کی طرح ارتقا پذیر رہا۔ لہٰذا ہمیں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی روشنی میں دورِ مابعد کے مکتوبات، بیانات، خطبات اور تصریحات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اقبالؒ کی سوچ ۱۹۲۹ء تک پہنچ کے رُک نہ گئی تھی بلکہ ''فکرِ اقبال'' تشکیل جدید کے بعد ایک مستقل کتاب کا تقاضا کرنے والا عنوان ہے۔ ان کا ہرگز یہ خیال نہیں تھا کہ افکارِ اسلامی کے متعلق انھوں نے جو خیالات خطبات میں ظاہر کیے تھے وہ حرفِ آخر ہیں۔ بلکہ آپ نے واشگاف الفاظ میں کہا ہے:

> میں نے عصرِ حاضر کی ذہنی اور فکری استعداد کے مطابق اسلام کو سمجھانے کی کوشش کی ہے فکرِ انسانی مسلسل ارتقا پذیر ہے اس لیے آیندہ اسلام کی تعبیر اور اس کی تشریح وتوضیح کے لیے نئے نئے پیرا ہائے بیان پیدا ہوں گے۔ اس لیے مسلمانوں کو فکرِ انسانی کی ترقی پذیری کی اس رفتار پر نگاہ رکھنی چاہیے تا کہ وہ آیندہ بھی عصرِ نو کی زبان میں اسلام کی تشریح کا فریضہ انجام دے سکیں۔[۱۶]

اقبالؒ کے نزدیک تدوین فقہ جدید وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہی آرزو ان کی زندگی میں ان کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اس عظیم ملی ضرورت کے لیے آپ مسلسل اور پیہم کوشاں رہے۔ آپ کے خیال میں ہر دور میں اسلامی نظام قانون میں ارتقا کا عمل جاری رہا ہے۔ یہ عمل خلافت راشدہ کے دور سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کے دور تک کسی نہ کسی طرح تدریجی ارتقائی مراحل سے گذرتا رہا ہے۔ علمائے فقہ نے اس اہم ترین کام کو ہر دور میں سرانجام دیا ہے۔ البتہ جب سے ہند میں علمی اور اسلامی میخانے (ادارے) بند ہوئے اسی وقت سے اسلامی قانون کے ارتقا کا عمل روک کر ایک خلا پیدا کر گئے۔ انھی عوامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ کہتے ہیں:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی[۱۷]

اقبالؒ کے نزدیک تین سو سال کے ارتقائی عمل کے خلا کو پر کرنے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ ایک مجلسِ قانون ساز بیٹھے جو اپنی فکری کوششوں سے اس خلا کو پر کردے۔ یہی مجلس قانون ساز جدید ریاست کی جدید ضروریات کے مطابق قانون اسلامی کو مرتب و مدون کرے اور موجودہ حالات میں اسے عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کے لیے دفعہ وار (codify) ترتیب دے۔ اس ضمن میں آپ نے واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے تاکہ زندگی کے ان سیکڑوں، ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے جن کو موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی ارتقا نے پیدا کیا ہے۔

آپ نے ۱۹۳۳ء میں ایک تقریر کے دوران کہا کہ میں علما کی اسمبلی کے قیام کا مشورہ دوں گا جس میں مسلمان وکلا بھی شامل ہوں جو فقہ سے واقف ہوں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور تجدید ہے اس طور پر کہ بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے۔ اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہو تاکہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لا پر اثر انداز ہوتا ہو، اس اسمبلی کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے عملی فائدے کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زمانۂ حاضر کو بھی اسلام کے قانونی ادب کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ آپ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین شامل کرنے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک: جدید زمانے کے اصول قانون (jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کا مطالعہ، دوسرے: اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ، تیسرے: فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصّبانہ مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک دور حاضر کے مسائل اتنے متنوّع ہیں کہ ان کا حل ایک عالم یا مفتی کے بس

کی بات نہیں بلکہ محض دینی علوم ہی کافی نہیں۔ آج کے مسائل کے حل کے لیے معاشیات، طبیعیات، قانون، نفسیات'' انجینیرنگ وغیرہ کا علم بھی ضروری ہے۔ ایک ہی شخص ان تمام علوم کا ماہر نہیں ہوسکتا، اس لیے مختلف علوم کے ماہرین کی شمولیت ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک اجتہاد اور اجماع دونوں کو اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے۔ اجتہاد انفرادی کے بجائے اجتماعی ہو، اور اس کے لیے ادارے قائم کیے جائیں۔

علامہ اقبالؒ نے اجماع اور قیاس دونوں کی تشکیل نو کی۔ اجماع کو آپ نے مصدر کی بجائے طریقہ اجتہاد اور اصول قانون کے طور پیش کیا۔ اجماع کی روایتی تعریف میں اجماع کی تمام ذمہ داری علما کی ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں اجماع کا مطلب ایسا ادارہ ہے جس میں علما دوسرے لوگوں کے ساتھ مل بیٹھ کر مسائل پر غور وفکر کریں اور اتفاق رائے سے مسائل کا حل تلاش کریں۔ یہاں اقبالؒ علما کی امتیازی حیثیت یا فقہی ولایت کے قائل نظر نہیں آتے۔ اجماع کی یہ حیثیت صرف اجماعِ صحابہ کو دی جاسکتی ہے۔ دورِ حاضر میں اقبالؒ کے نزدیک قانون ساز اسمبلیاں اجماع کے اداروں کا کام کرسکتی ہیں۔ آپ کے خیال میں مسلم مما لک کی اسمبلیاں بھی اجماع پر عمل کرسکتی ہیں اور اس میں علمائے دین کے ساتھ دوسرے واقف کار اور ماہرین فن بھی شریک ہوسکتے ہیں، اگرچہ غیر مسلم اکثریت والے مما لک، مثلاً ہندستان میں یہ ایک نازک مسئلہ بن جائے گا۔ مگر جہاں تک مسلم مما لک کے قانون ساز اداروں کا تعلق ہے تو عارضی طور پر علمائے دین کی ایک ایسی مجلس بنائی جاسکتی ہے جو اسمبلی کے اندر منظور ہونے والے ہر قانون کی نگرانی کرے، جیسا کہ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور میں انتظام کیا گیا۔ اگرچہ علامہ کے نزدیک یہ چیز بھی خطرناک ہے اور یہ ایران کے شیعوں کے اس عقیدے پر مبنی ہے کہ بادشاہ صرف مملکت کی خبر گیری کرنے والا ایک منتظم ہوتا ہے جبکہ اصل اقتدار ایک غائب امام کا ہوتا ہے جس کی نیابت علمائے دین کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک سُنی ریاستوں کو چاہیے کہ قانون سازی میں علما کو بطور ایک مؤثر جزو شامل تو کرلیں لیکن علما بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث وتمحیص اور اظہارِ رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی صحیح رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دیں۔ بایں ہمہ شریعتِ اسلامی کی غلط تعبیرات کا سدباب ہوسکتا ہے تو صرف اس طرح کہ موجودہ اسلامی نظام قانون میں اہم تبدیلیاں لائی جائیں اور ایسے وسیع النظر ماہرینِ قانون یعنی فقیہ پیدا ہوسکیں جو فقہ قدیم اور قرآن وسنت کے علم کے علاوہ جدید فلسفۂ قانون (Modern Jurisprudence) سے بھی کما حقہ آشنا ہوں اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ادارۂ قانون ساز کے اندر بیٹھ کر اپنی آئینی حیثیت کے مطابق احکامِ دین کی صحیح ترجمانی اور اطلاق کا سامان کرسکیں۔[۱۸]

علامہ اقبال سے ملتی جلتی رائے دورِ جدید کے اہم اسلامی دینیات کے ماہر محمد تقی امینی کی بھی ہے۔ آپ فقہا کے بجائے ''اہل حل وعقد'' کہتے ہوئے ایسے اہل بصیرت وتجربہ کار لوگوں کی طرف اشارہ کرتے

ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہوئے، اس قانون ساز مجلس کے معاون بن سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اجماع کی اصل اور ممکن العمل صورت یہی ہے کہ قانونی معاملات میں اہل حل وعقد کی ایک مجلس مشاورت قائم ہو اور حالات و مسائل کے غور وفکر کے بعد اس کا صحیح حل تجویز کرے جو کہ ایک طرف کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو اور دوسری طرف ضروریاتِ زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا بھی ہو۔[۱۹]

آپ کے اس اقتباس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا مجلسِ مشاورت سے مراد پارلیمنٹ ہے یا مجلس قانون یا محض اہل حل وعقد کی ایک جمعیت جو مشورے پیش کرتی رہے۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ ''اہل حل وعقد'' سے اُن کی کیا مراد ہے، یعنی وہ لوگ کن اوصافِ حمیدہ کے مالک ہونے چاہییں اور علم ودین سے ان کی آگہی کا درجہ کیا ہوگا۔ یہ جملہ مسائل ان کے یہاں تشنۂ تشریح ہیں۔ علامہ اقبالؒ محدود عرصے کے لیے علما اور دانش وروں کا باضابطہ بورڈ تشکیل دینے کے حق میں ہیں جو براہِ راست دینی مسائل ومعاملات سے تعلق رکھنے والے امور پر صلاح ومشورے سے رائے دیں۔ اقبالؒ کے اس ''اجتماعی اجتہاد'' کی تائید عالم اسلام کے ایک مشہور جدید فقہی عالم استاذ ابوزہرہ کے خیالات سے بھی ہوتی ہے۔ دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ اقبال ''اجتماعی اجتہاد'' کو موجودہ پارلیمانی ایوان کی صورت دینا چاہتے ہیں اور ابوزہرہ اس کو ذرا وسیع کرتے ہوئے پوری اُمّت مسلمہ کے لیے، ایک ایسی اکیڈمی میں تبدیل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو بالکل اسی طرز کی ہونی چاہیے جیسے ہمارے ہاں آج کل کی لسانی اور سائنسی اکیڈمیاں ہیں۔ وہ ایک فقہی اکیڈمی قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جس میں ایسے بلند پایہ فقہا ہر اسلامی ملک سے چُنے جائیں جو موجودہ مروّجہ علوم سے بھی پوری طرح واقف ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ میں بھی اعلیٰ معیار کے حامل ہوں۔[۲۰]

علامہ اقبالؒ کے خیال کے مطابق استاذ ابوزہرہ کے علاوہ دوسرے معاصر علما نے بھی دورِ جدید کے مقتضیات کے تحت اجتماعی اجتہاد اور اجتماعی فقہی اکیڈمیوں کے قیام پر زور دیا ہے۔ ان میں شیخ عبدالوہاب خلاف[۲۱]، شیخ محمود شلتوت[۲۲]، شیخ مصطفیٰ الزرقا[۲۳]، شیخ طاہر بن عاشورہ[۲۴] اور ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ یہاں تک فرماتے ہیں:

ہمارے لیے ضروری ہے کہ عربی زبان وادب کے ساتھ اسلامی فقہ اور اس کی توضیح وتشریح کے لیے ایک اکیڈمی ہو، کیونکہ عربی اکیڈمی تو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہے لیکن فقہ اکیڈمی کی ضروریات زیادہ شدید ہیں اس لیے کہ پیش آمدہ مسائل میں قرآن وسنت کی رہنمائی تلاش کرنا زبان کے مسائل سے زیادہ تنوع اور تراکیب رکھتا ہے۔ لیکن کسی فرد واحد یا متعدد افراد سے جو مختلف موضوعات پر اپنے طور سے کام کر رہے ہیں یہ کام انجام نہیں پاسکتا۔ لہٰذا ایک ایسی اکیڈمی کی ضرورت ہے جو ہر سال پیش آمدہ

مسائل پر علما کو دعوتِ تحقیق دے اور ہر موضوع کا ماہر اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کی تفصیلات کا مطالعہ کرے۔ پھر اجتماعی طور پر ہر سال مذاکرہ ہو جس میں ہر فرد اپنے خیالات و نتائجِ تحقیق پیش کرے۔ پھر اجتماعی قرارداد منظور کی جائے اور اس کی بنیاد پر شرعی حکم کا نفاذ ہو جس پر عمل کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہو، میرے نزدیک اسی عمل کا نام اجماع ہے۔[۲۵]

متعدد علمائے عصر نے اقبالؒ کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے لیے دورِ حاضر میں علمی ولسانی اکیڈمیوں کے طرز پر فقہ اسلامی کی ایک انٹرنیشنل (مسلم) اکیڈمی قائم کرنے پر زور دیا ہے جس میں عالم اسلام کے مشہور اور راسخ علما کی خدمات حاصل کی جائیں اور اس کا نام ''الفقۃ الاسلامی العالمی'' (عالمی فقہ اکیڈمی) ہو۔[۲۶] یہی عالمی فقہ اکیڈمی ان گوناگوں مسائل کا اسلامی حل تلاش کر سکتی ہے جو امت مسلمہ کو آج کل درپیش ہیں۔ اسی جذبے کے تحت ۱۹۷۶ء میں ''رابطہ عالم اسلامی'' نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کی۔ یورپ اور مسلم دنیا کی متعدد فقہ اکیڈمیاں اس سے وابستہ ہوئیں اور اس کی کونسل اپنے سالانہ اجتماعات میں مسلمانوں سے متعلق فقہی امور میں جو فیصلے کرتی ہے بالعموم انھیں حتمی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک قیاس یعنی (Analogy) سے مراد قانون سازی میں مماثلتوں کی بنا پر استدلال سے کام لینا ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں اقبالؒ بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں بھی فقہا نے یونانی منطق کو اسلامی طریقہ استنباط پر فوقیت دے دی۔ اس لیے آپ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اجتہاد میں استخراجی کی بجائے استقرائی منطق اور مقاصد شریعت پر توجہ مرکوز کی جائے۔ اپنے چھٹے خطبے ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں اقبال اپنے زمانے کی خواتین کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تقلید اور قیاس کی پابندی کی وجہ سے خود دین اسلام پر زد پڑتی رہی تھی۔ مثلاً لاپتہ خاوند کی بیوی کو حنفی فقہا پچاس سال تک انتظار کراتے تھے۔ خاوند مار پیٹ کرے، نان ونفقہ روک لے یا دوسرے طریقوں سے بیوی پر ستم ڈھائے تو حنفی فقہ کے مطابق بیوی کو عدالت میں جانے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ان سخت قوانین سے تنگ آ کر مسلمان عورتوں نے شوہروں کے ظلم وستم سے آزادی حاصل کرنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا کہ وہ عدالتوں میں حاضر ہو کر مذہب ترک کرنے کا اعلان کرتیں اور تنسیخ نکاح کا دعویٰ کر کے شوہر سے آزاد ہو جاتیں۔ ان میں اکثر بعد میں دوبارہ مسلمان ہو جاتیں لیکن اس سے ارتداد کا فتنہ شروع ہوا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے یعنی ۱۹۲۰ء-۱۹۲۵ء تک عدالت میں ایسے مقدمات کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مسلمان عورتوں نے تنسیخ نکاح کے لیے عیسائی ہونے کا دعویٰ کیا۔ ان حالات میں علامہ اقبالؒ ہی نے سب سے پہلے عالم اسلام کو اس جانب توجہ دلائی۔ آپ نے واضح کیا کہ مذہب، عقل،

نسل اور جان و مال کی حفاظت تو اسلامی قانون کے مقاصد میں سے ہے۔ لہٰذا اگر فقہ اسلامی نے مظلوموں کی دادرسی نہیں کی تو لوگ مذہب سے برگشتہ ہوکر کوئی اور راہ اپنا لینے پر مجبور ہوں گے۔[۲۷]

انھی عوامل کے پیش نظر علامہ اقبالؒ قیاس کی جگہ مقاصد شریعت کے استدلال کی ضرورت پر زور دیتے ہیں تا کہ درج بالا اور دیگر مسائل آسانی سے حل کیے جا سکیں۔ اگر چہ علامہ کو ان مسائل کے ابھارنے پر مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس سے بحث وتمحیص کا دروازہ کھل گیا اور عورتوں کے مسائل پر گفتگو کا آغاز ہوگیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بعض دوسرے علما کی اس جانب توجہ دلائی۔ حرمین شریفین کے علمائے دین سے خط وکتابت کی۔ فقہ حنفی کے علاوہ دوسرے مذاہب فقہ کی آرا کا جائزہ لیا اور پھر تحقیق وتفتیش کے بعد ایک جامع و مانع تحریر الحیلۃ الناجزۃ للحلیۃ العاجزۃ کے نام سے منظر عام پر لائے جو درحقیقت علمائے دیوبند کی ایک مجلس کا اجتہاد ہے۔ اس میں لا پتہ خاوند، نان ونفقے کی تنگی، شوہر کی مار پیٹ اور ظلم وستم وغیرہ مسائل پر عورتوں کو عدالت میں جانے کا حق تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ شوہر بیوی کو طلاق کا حق تفویض کرسکتا ہے اور جب حالات نا قابل برداشت ہوجائیں تو بیوی اس حق کو استعمال کرتے ہوئے شوہر کو طلاق دے سکتی ہے۔ اسی تحریری اجتہاد کو بنیاد بنا کر مسلمانانِ ہند نے ایک شریعت بل قانون ساز اسمبلی کو پیش کیا جو بالآخر ۱۹۳۹ء میں تنسیخ نکاح کے ایکٹ کی صورت میں منظور ہوگیا۔ بیسویں صدی میں اجتہاد اور اس کی بنیاد پر قانون سازی کی یہ ایک اہم مثال تھی۔[۲۸] اول تو اس میں واقعتاً پیش آمدہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ علامہ اقبالؒ اسی حل کے لیے قیاس کے بجائے مقاصد شریعت سے استدلال پر زور دیتے ہیں۔ دوسرے: علما کی جماعت نے اس اجتہاد میں برابر شرکت کی۔ یہ اجتہاد فی المذہب نہیں تھا یعنی صرف حنفی مذہب تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ دوسرے مذاہب کی آرا پر عمل کا فتویٰ دیا گیا۔ تیسرے: یہ اجتہاد باقاعدہ قانون سازی کے عمل سے گذر کر قانون بنا۔ چوتھے: یہ قانون ایک غیر مسلم حکومت کی منظوری سے جاری ہوا۔

آزادی کے بعد مسلم ممالک کو جو مسائل درپیش رہے، ان میں طرزِ حکومت، معاش اور معاشی استحکام، قانون سازی اور تعلیم وغیرہ کے بنیادی مسائل کا شامل ہیں، ان میدانوں میں بھی انقلابی اقدامات اور اجتہادات کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کے تحت پاکستان میں بھی کئی تحقیقی ادارے قائم کیے گئے۔ کراچی میں 'مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی' ۱۹۶۰ء میں قائم کیا گیا جو اب 'ادارۂ تحقیقات اسلامی' کے نام سے بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ لاہور میں بھی 'ادارۂ ثقافت اسلامیہ' اور 'اقبال اکادمی' قائم کی گئی۔ جہاں پر علوم اسلامی اور اقبالیات پر تحقیق کا کام شدومد سے جاری ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں 'اسلامی اکیڈمی' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ 'اسلامی مشاورتی کونسل' قائم کی گئی جو اب 'اسلامی نظریاتی

کونسل' کے نام سے کام کر رہی ہے۔ ان اداروں نے تحقیقی اور اشاعتی منصوبوں کے ساتھ ساتھ بیشتر ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر بھی اجتہادات پیش کیے۔ 'ادارۂ ثقافت اسلامیہ' نے خلیفہ عبدالحکیم کی قیادت میں معاشی، سیاسی اور قانونی مسائل پر تحقیقات شائع کیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے خود بھی ان مسائل پر خامہ فرسائی کی اور قانون سازی میں برابر حصہ لیتے رہے۔[۲۹] اس طرح انھوں نے علامہ اقبال کے فقہ جدید کے ادھورے خواب کو آگے لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 'ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی' اور 'اسلامی نظریاتی کونسل' نے بھی اجتہادی پیش رفت میں حصہ لیا۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (جامعہ ملیہ اسلامیہ) دہلی کے اہتمام سے دسمبر ۱۹۷۶ء کے اواخر میں ایک اعلیٰ پائے کا سیمینار منعقد کیا گیا جس میں اجتہاد اور اقبال کے حوالے سے کم و بیش دس مقالے پڑھے گئے اور جولائی ۱۹۷۸ء میں مرحوم مشیر الحق اور ضیاء الحسن فاروقی کے اہتمام سے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے عنوان کے تحت یہ مقالات کتابی صورت میں چھپ گئے۔

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو سٹڈیز نئی دہلی علوم اسلامیہ کی تحقیق و تدریس کے حوالے سے عہدِ حاضر میں قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ چند سال پہلے اس تحقیقی دانش کدے نے نظریۂ اجتہاد کے وسیع موضوع پر ایک بہت بڑا سیمینار منعقد کرایا جس میں ملک و ملت کے مستند و سر برآوردہ علما اور دانش وروں نے اپنے وقیع و شان دار تحقیقی مقالات پڑھے۔ یہ مقالات اجتہاد اور مسائل اجتہاد کے نام سے ۱۹۹۸ء میں کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سرینگر نے بھی اقبالیاتی ادب اور اسلامیات کے بارے میں اپنے قیام سے لے کر اب تک قابلِ قدر تحقیقی و تنقیدی کام انجام دیا ہے۔ اس ادارے کا آغاز ۱۹۷۷ء میں پروفیسر آل احمد سرور کی سربراہی میں ہوا۔

دراصل اس ادارے کا مقصد تحقیق و تدوین کے ذریعے علامہ اقبال کی حیات اور فکر و فن کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ رہا ہے تاکہ فکرِ اقبال کے ساتھ ساتھ سچی دانش وری کو فروغِ عام مل سکے۔ اب تک اس شعبے میں اقبالیاتی فکر و فلسفہ اور شاعری کے حوالے سے بائیس ایم۔فل اور بارہ پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور تحقیقی عمل برابر جاری و ساری ہے۔

علامہ اقبالؒ کی دعوتِ اجتہاد سے بیسویں صدی میں اجتہاد کا عمل کافی تیز رہا، جس میں علما اور مدارس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس ضمن میں ایک اہم پیش رفت دارالافتاء کا قیام ہے۔ تقریباً ہر دینی مدرسے میں دارالافتاء قائم کیا گیا ہے جہاں فتاویٰ کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔ ان کے جوابات دیے جاتے ہیں اور پھر مجموعوں کی شکل میں چھپنا شروع ہوتے ہیں۔ تقریباً تمام اسلامی ممالک میں اب فتاویٰ کے ادارے قائم کیے

گئے ہیں اور وہاں سے اب باضابطہ طور پر فتاویٰ کے مجموعے شائع ہوتے ہیں۔ جامعہ الازہر کا الفتاویٰ الاسلامیہ تیرہ سے زیادہ جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ بیسویں صدی کی ایک اور اہم پیش رفت اجتماعی اجتہاد کے ادارے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب میں المجمع الفقہی اور بھارت میں ''اسلامی فقہ اکیڈمی'' جہاں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد امت مسلمہ کو پیش آمدہ مسائل پر علما اور فقہا مل بیٹھ کر غور وفکر کر کے اپنی آرا پیش کرتے ہیں۔ ان کی آرا پر مبنی فتاویٰ کے مجموعے شائع کیے جاتے ہیں اور ان کو بنیاد بنا کر جدید فقہی کتابیں بھی ترتیب دی جاتی ہے۔

عالم اسلام میں ہر جگہ اب اجتماعی اجتہاد کے لیے باضابطہ کام شروع ہو چکا ہے۔ مراکش، سعودی عرب اور کویت، تینوں ملکوں میں فقہ کی انسائی کلو پیڈیا مرتب و مدوّن کرنے کا پروگرام ہاتھ میں لیا گیا ہے اور اس کا نام انھوں نے الموسوعۃ الفقہیہ رکھا ہے۔ اس سلسلے میں کویت پیش قدمی کر کے ۲۰ جلدوں میں یہ کام اختتام تک پہنچانے کے قریب ہے۔ اصول فقہ پر سب سے زیادہ اور محققانہ کام مصر میں ہوا ہے۔

عالم اسلام میں بیسویں صدی میں اجتہاد کے ارتقا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے مندرجہ ذیل خصوصیات ممتاز نظر آتی ہیں۔ اوّل تو اقبال کی آرزو کے مطابق اجتماعی اجتہاد کی شکل ابھر کر سامنے آئی ہے۔ دوسرے: تحقیق و اجتہاد کے وسائل میں بہت پیش رفت ہوئی ہے۔ علوم قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ کی بہت سی نادر کتابیں جن کے اب تک صرف نام سنے جاتے تھے، اب شائع ہو کر دستیاب ہیں۔ تیسرے: تحقیق و اجتہاد کے لیے بہت سی امدادی کتابیں سامنے آ گئی ہیں جن میں معاجم، اشاریے اور فہارس وغیرہ شامل ہیں۔ کمپیوٹر نے اس کام کو مزید آسان اور سہل بنا دیا ہے۔ اب فقہ کی بنیادی کتابیں سیکڑوں کی تعداد میں سی ڈی روم پر بھی دستیاب ہیں۔ چوتھے: اجتہاد کے رجحانات میں اب مقاصدِ شریعت سے استنباط کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس عصر میں علامہ اقبال نے ہی پہلی مرتبہ اس اصول کی طرف توجہ دلائی۔ اب اس موضوع اور اصولِ استنباط پر کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ سعید اکبر آبادی بجا لکھتے ہیں کہ:

> عالم اسلام میں اس وقت اسلامی قوانین کی تدوینِ جدید کے لیے جتنی انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہو رہی ہیں، یہ سب دراصل اقبال کے خواب کی تعبیریں ہیں۔ اس لیے اگر آج وہ زندہ ہوتے تو اس پر مسرور ہونے کا حق ان سے زیادہ اور کسے ہوتا۔[۳۰]

ان دنوں نہ صرف عالم اسلام میں بلکہ پورے کرۂ ارض پر احیائے اسلامی کے چرچے ہیں۔ یورپ اور امریکہ تک کے براعظموں میں وہاں کے دانش ور حلقے اور رائے عامہ کو منظّم کرنے والے عناصر سوچنے لگے ہیں کہ ایشیا اور امریکہ کے مسلمانوں کو صدیوں تک اپنے استعمار واستبداد کی گرفت میں اسیر رکھنے کے باوجود، اسلام کا جذبہ مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں کیوں زوال پذیر نہیں ہو سکا اور چار طرف سے

اسلام کے حرکی (Dynamic) نظام کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سی کیوں سنائی دے رہی ہے۔ یہ راز معلوم کرنے کے لیے قرآن و حدیث، اسلامی فقہ اور اسلامی تہذیب کا از سرِ نو بیدار ذہنیت کے ساتھ مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ ایک زمانے میں تو ایک سامراجی قائد نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے ایک ایسا نظام تعلیم ترتیب دیا ہے جو مسلمانوں کے اسلامی تشخص (identity) اور امتیاز کو ختم کر دے گا اور مسلمانوں کی ایسی نسل تیار کرے گا جس کی شکل و صورت مسلمانوں جیسی ہوگی لیکن فکر غیر اسلامی ہوگی، وہ اپنے مظاہر میں تو آزاد ہوں گے لیکن فکری اور ذہنی اعتبار سے وہ مغرب کے غلام ہوں گے۔ مگر یہ اسلامی نظام حیات کی کرشمہ سازی ہی ہے اور عصر حاضر میں علامہ اقبال جیسے متبحّر مفکرینِ ملّت کی ان تھک فکری کوششوں ہی کا ثمر ہے کہ معاملہ اب اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب تو موجودہ مسلمان نسل بظاہر مغرب زدہ نظر آتی ہے لیکن اس کا دل اسلامی نظامِ حیات کی محبت سے سرشار اور اس کا دماغ اسلامی افکار و نظریات سے منوّر ہے۔

آج ہم بچشم خود یورپی اور امریکی ممالک میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ وہاں جگہ جگہ پر مساجد، اسلامک سنٹرز اور اسلامی تحقیقاتی مراکز قائم ہو رہے ہیں۔ اب تو وہاں ہزاروں، لاکھوں افراد اسلام کے اجتہادی نظامِ فکر و عمل سے متاثر ہو رہے ہیں۔ الحاد، بے یقینی اور لامذہبیت کی دُھند اُن کے دل و دماغ سے نکلتی جا رہی ہے۔ یہی اسلام کی عالم گیریت کے واضح امکان کا ایک بلیغ اشارہ ہے اور علامہ اقبالؒ نے اسی روشن مستقبل کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا ہے:

گئے دن کہ تنہا تھا مَیں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں[۳۱]

❁......❁......❁

حوالہ جات و حواشی

۱۔ سمیع اللہ، ''خطباتِ اقبال کا پس منظر''، (مشمولہ) صحیفہ، جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۱۳۲۔
۲۔ سید وحید الدین، تفکر اقبال، اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونی ورسٹی، سرینگر، مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۔
۳۔ عبدالمغنی، اقبال کا نظریہ خودی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص ۹۷۔
۴۔ علامہ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم سید نذیر نیازی، اسلامک بک فاؤنڈیشن، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۴۰۔

۵۔ علامہ اقبالؒ کے اجتہادات پر وقتاً فوقتاً تنقید ہوتی رہی، مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ اور سید ابوالحسن ندویؒ نے علامہ اقبالؒ کے خطبات کے بارے میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اگر یہ شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سید ابوالحسن ندوی کی روائع اقبال، کا اردو ترجمہ نقوش اقبال مترجم شمس تبریز کراچی مجلس نشریاتِ اسلام ۱۹۷۳ء) اس کتاب کے صفحہ ۴۰ نمبر ۱ میں تحریر ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا کہنا تھا کہ کاش یہ کتاب شائع نہ ہوتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اصل عربی کتاب یعنی روائع اقبال کے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۳ء کے اڈیشن میں یہ حاشیہ اور عبارت شامل نہیں ہے۔ بہرحال مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اس قول پر مولانا سعید اکبر آبادی تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''اگر اس قول کی نسبت ان حضرات کی طرف صحیح ہے تو یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے خطبات کا اول تا آخر توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے یا کچھ سن سنا کر یا خطبات کی سرسری ورق گردانی کے بعد انھوں نے یہ اظہار خیال کیا ہے۔۔۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے افکار و نظریات اسلامی کی تاریخ پر نظر نہیں ہے۔ فقہ، علم کلام، تفسیر اور فلسفہ و تصوف میں کتنے مکاتب فکر پیدا ہوئے اور ان میں بحث و جدال کی کیسی گرم بازاری رہی؟ اسلامیات کا ہر طالب علم اس سے واقف ہے۔''

(مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: خطبات اقبال پر ایک نظر از سعید اکبر آبادی)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے مطابق ۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو انجمن حمایت اسلام میں ''روحِ تہذیب اسلامی'' یعنی The Spirit of Islamic Culture پر جب علامہ اقبال نے لیکچر دیا (جو کہ خطبات کا پانچواں لیکچر ہے) تو اُس وقت انجمن کے سالانہ جلسے میں سید سلیمان ندوی بھی پہلی بار شریک ہوئے۔ اقبال کے ساتھ بہت سی دعوتوں میں مدعو ہوئے اور علمی مسائل پر تبادلہ خیال ہوا۔ واپسی پر سید سلیمان ندویؒ نے معارف (مئی، ۱۹۲۷ء) میں اپنے سفرِ لاہور کے تاثرات رقم کیے اور اقبال کے بارے میں لکھا:

''ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمعِ محفل تھے۔ انھوں نے تو ''شمع اور شاعر'' لکھا ہے لیکن میں نے لاہور میں خود ''شاعر کو شمع'' دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ ان کی صحبت، لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے۔ ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات، ان کی آس پاس کی دُنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں۔ ان کی زمزمہ پردازیوں کا مجموعہ زبورِ عجم کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیرِ داؤد کی دعاؤں سے بدل دے، اور ان کے کانوں کو زبور کا ''پردہ'' رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے''۔

(ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اقبال کا ذہنی ارتقا، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ص ۱۱۰)

۶۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۹۔
۷۔ سعید اکبر آبادی، خطبات اقبال پر ایک نظر، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سرینگر، ص ۵۴۔
۸۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۲۲۹۔
۹۔ سعید اکبر آبادی، خطبات اقبال پر ایک نظر، اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونی ورسٹی سرینگر، ص ۵۵۔
۱۰۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۴۶۔
۱۱۔ ایضاً، ص ۶۸۴۔
۱۲۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص ۶۵۴۔

۱۳۔ ایضاً۔
۱۴۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)،ص۶۵۴۔
۱۵۔ ایضاً،ص۶۷۹۔
۱۶۔ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،مقدمہ از مترجم،ص۳۴۔
۱۷۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)،ص۳۵۱۔
۱۸۔ محمد اقبال'الاجتہاد فی الاسلام،(مشمولہ) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ،ص۱۷۶۔
۱۹۔ مولانا محمد تقی امینی ،فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر،اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ڈھاکہ،۱۹۷۵ء،ص۲۷۔
۲۰۔ استاذ ابوزہرہ،''الاجتہاد فی الفقہ الاسلامی'' (مشمولہ) الندوۃ العالمیہ الاسلامیہ،مطبوعہ جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۵ء،ص۱۰۹۔
۲۱۔ عبدالوہاب خلاف،مصادر التشریع الاسلامی فی ما لا نص فیہ،دارالقلم،کویت،۱۹۷۰ء،ص۱۳۔
۲۲۔ شلتوت،الاسلام: عقیدۃ و شریعۃ،کویت ۱۹۷۰ء،ص۵۵۸۔
۲۳۔ الزرقاء، الاجتہاد، بیروت، ص۱۱۷۔
۲۴۔ محمد الطاہر بن عاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ،طبع اول ۱۹۷۸ء،ص۱۴۰-۱۴۱۔
۲۵۔ محمد یوسف موسیٰ،الاسلام والحیاۃ ،مکتبہ وہبۃ،قاہرہ،۱۹۶۱ء،ص۱۸۷۔
۲۶۔ اسی ضرورت کے پیش نظر عالم عرب میں دو قابل ذکر ادارے قائم ہیں:
(ا) مجمع البحوث الاسلامیہ ،مصر
(ا) المجمع الفقہی، رابطہ العالم الاسلامی، مکہ۔
۲۷۔ محمد اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ،چھٹا خطبہ،ص۲۷۷۔
۲۸۔ محمد خالد مسعود، اقبال کا تصور اجتہاد،راولپنڈی،مطبوعات حرمت ۱۹۸۵ء،ص۲۰۳۔
۲۹۔ پاکستان میں اجتہادی مساعی میں سب سے پہلا نمایاں کام عائلی قوانین کا تھا جو ۱۹۶۲ء میں جاری ہوا۔ اس قانون سازی میں خلیفہ عبدالحکیم پیش پیش تھے۔ عائلی کمیشن کی سفارشات حکیم صاحب مرحوم کی تیار کردہ ہیں۔ ان قوانین میں پہلی بار کسی ایک فقہی مکتب کی تقلید کی بجائے قرآن وسنت کی روشنی میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے عائلی قوانین مرتب کیے گئے۔ یہ اجتہادی سرگرمیاں دراصل اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جس کا آغاز علامہ اقبال کی دعوتِ اجتہاد سے ہوا اور جس کے نتیجے میں مولانا تھانویؒ کی اجتہادی الحیلۃ الناجزہ اور ۱۹۳۹ء کا قانون تنسیخ نکاح ظہور میں آئے تھے۔
۳۰۔ سعید اکبرآبادی، خطبات اقبال پر ایک نظر،ص۶۹۔
۳۱۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)،ص۳۹۰۔